رشید امجد کے افسانوں میں مزاحمت کا علامتی اظہار

مدثر علی خان[1]

Abstract:

It is not duty of writer to solve different problem of society, but his duty is to point out the issues and write them in the shape of literature. There are different types of issues, some can explain in simple word and some require ambiguous writing. Writers use symbolic technique to express these sorts of issues and specially that are restricted. Author has tried to present Rasheed Amjid's symbolic resistance against martial law. Author has also tried to present that which type of symbols Rasheed Amjid has used to address his issues and to what extant he succeeds.

Keywords: **Urdu Fiction, Afsana, Pakistani Urdu Afsana, Rasheed Amjad, Martial Law, Resistance, Symbolism.**

کلیدی الفاظ: اردو افسانہ، پاکستانی اردو افسانہ، رشید امجد، مزاحمت، مارشل لاء، علامت نگاری

ڈاکٹر انوار احمد نے رشید امجد کو ''جدید افسانے کا قد آور نام'' کہا ہے۔[(1)] اور یہ سو فی صد درست ہے کہ رشید امجد اُردو افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں میں دونوں دُنیاؤں کے کئی جہان آباد ہیں۔ اُن کے یہاں داخلی موضوعات بھی پائے جاتے ہیں اور خارجی بھی۔ وہ نفسیاتی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرتے ہیں اور مارکسی نقطہ نظر کو بھی۔ اُن کے یہاں علامت بھی پائی جاتی ہے تجرید بھی۔ اُن کے موضوعات میں انسان، انسانی رویے، انسانی جذبات، معاشرہ، معاشیات، نفسیات، مارشل لاء اور مذہبی موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صفیہ عباد لکھتی ہیں:۔

> ''رشید امجد نے فرد، معاشرہ، کائنات اور عہدِ حاضر کے ہر لمحہ بدلتے حالات و واقعات، خواہ ان کا تعلق سیاست سے ہو یا نفسیات سے، معاشرت سے ہو یا معیشت سے، مذہب ہو

1 پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو واقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

یا اخلاق، محسوسات ہوں یا تاثرات، زندگی کے گونا گوں تجربات و مشاہدات افسانے میں دخیل کیے۔''(2)

رشید امجد نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ راولپنڈی اور اسلام آباد میں گزارا۔ اسلام آباد شہر اقتدار اور راولپنڈی جی۔ایچ۔کیو کا مسکن ہے۔ شہر اقتدار میں کیے جانے والے فیصلوں کے اثرات عوام کے چولہوں تک مرتب ہوتے ہیں اور راولپنڈی میں واقع جی۔ایچ۔کیو اگر کبھی اپنے فرائض سے تجاوز کرتے ہوئے شہر اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھال لیتا ہے تو اس کے اثرات بھی عوام کی اندرونی اور بیرونی دُنیاؤں کو شدت سے متاثر کرنے لگتے ہیں۔ عوام کو بہر حال تمام فیصلے ماننا پڑتے ہیں اور پابندیاں جھیلنا پڑتی ہیں لیکن ان پابندیوں میں بھی جرأت مندادباء اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں اور علامتی انداز میں مزاحمت کرتے رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو راولپنڈی اور اسلام آباد کے رہنے والے حکومتی فیصلوں کے اثرات زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں میں بھی مزاحمت کے علامتی اظہار کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔ جن کی مثال درج ذیل افسانے ہیں۔

رشید امجد اپنے افسانے ''بے پانی بارش'' میں پاکستانی عوام، سرمایہ داری نظام، سیاست، امریت اور سقوطِ ڈھاکہ کو علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔ اس افسانے میں سیاہ ڈراؤنی رات وہ رات ہے جس رات مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کر دیا گیا۔ رات دُکھ اور صبح اُمید نو کی علامت ہے لیکن ہر رات کے اختتام پر آنے والی صبح کے اپنے اثرات ہوتے ہیں۔ رشید امجد سقوطِ ڈھاکہ کو ایسی ڈراؤنی رات کہتے ہیں جس کی صبح سے بھی ڈر لگتا تھا۔ اس رات کے گزارنے والوں کو یہ ڈر تھا کہ یہ رات جاتے جاتے اپنے ساتھ ان کی شناخت بھی لے جائے گی۔ چہرے سے ہر انسان کی شناخت ہوتی ہے اور ملک سے بھی۔ یہاں چہرے کو ملک کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس ڈراؤنی رات کے بعد ملک کی شناخت میں جو تبدیلیاں آئیں اُن سے سب واقف ہیں۔ پاکستان جس کے دو حصے؛ ایک مشرقی پاکستان اور دوسرا مغربی پاکستان تھے اُن میں سے صرف مغربی پاکستان بچا اور مشرقی پاکستان بنگلا دیش میں تبدیل ہو گیا۔ رشید امجد اس سیاہ ڈراؤنی رات کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''ساری ہی راتیں تاریک اور ڈراؤنی ہوتی ہیں، لیکن وہ رات اتنی گھنی، سیاہ اور ڈراؤنی تھی کہ اُسے اپنے آپ سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سمیٹ کر ایک کونے میں ڈھیر کر لیا تھا اور اب اس خوف سے ہاتھ بھی نہیں ہلا رہا تھا کہ کہیں اس کے اپنے ہاتھ ہی اسے نہ دبوچ لیں۔ حالانکہ بار بار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر تسلی کر لے کہ اس کی گردن پر اس کا چہرہ موجود ہے۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ اس کے چہرے میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ اس کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔''(3)

رشید امجد اس ڈراؤنی رات اور اُس کے اثرات کے خوف کو کچھ یوں رقم کرتے ہیں:۔

''اس نے سوچا، کاش یہ گھنی سیاہ ڈراؤنی رات اتنی پھیل جائے کہ وہ کبھی اپنے چہرے کو نہ دیکھ سکے۔ لیکن ہر رات کی ایک صبح ہوتی ہے، اس اداس گھنی سیاہ ڈراؤنی رات کی بھی ایک صبح تھی اور وہ اس سے بچنا چاہتا تھا۔ یہ بھی عجیب بات تھی۔ وہ صبح کے تصور ہی سے کھل اُٹھا کرتا تھا۔ لیکن یہ ایسی صبح تھی جس کے خیال سے اس کا سر جھکا چلا جا رہا تھا۔''(4)

پاکستان کے اوائل میں ہی اس کے شہتیروں کو دیمک نے چاٹنا شروع کر دیا تھا۔ جب یہ لوگ قوم بن کر اُبھرے تو انھوں نے ملک حاصل کر لیا لیکن جب ملک مل گیا تو قوم نہ رہے۔ مختلف عوامل نے مل کر پہلے پاکستان کو مارشل لاء کی جانب دھکیلا اور پھر سقوطِ ڈھاکا کے راستے پر ڈال دیا۔ ان عوامل میں سب سے زیادہ کارفرما رہنے والا عمل سیاست دانوں، آمروں اور عوام کا منافقانہ رویہ تھا۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''وہ چبوترے پر چڑھ گیا اور چیخ کر کہنے لگا، ''کیا تم جانتے ہو ہم کھیتوں میں منافقت بو رہے ہیں؟'' اس کے گرد جمع لوگوں میں سے کچھ تو اس کی بات سن کر ہنس پڑے اور کچھ غصے میں بڑبڑاتے ہوئے اپنے اپنے راستوں پر چل دیے۔''(5)

اکیسویں صدی میں تین نظریات نے زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا، یہ نظریات؛ کارل مارکس کا نظریہ، سگمنڈ فرائیڈ کا نظریہ اور ڈارون کا نظریہ ہیں۔ ہمارے ادب میں ان نظریات کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کی نفی کا نعرہ بلند کیا اور اُس کی تقلید میں کئی ادیبوں نے شاندار ادب پارے تخلیق کیے۔ سرمایہ دارانہ نظام پاکستان کی سرزمین پر قبل از پاکستان موجود تھا اور پاکستان بننے سے اب تک

موجود ہے۔ پاکستان میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہوئے رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''پھر اُس نے خواب دیکھا کچھ لوگ کھلیانوں اور کارخانوں میں بھوک بانٹتے پھر رہے ہیں۔ کسان اور مزدور اپنے کاموں میں بھوک کی بھیک لے کر ایک دوسرے کے گریبان پکڑ رہے ہیں۔ اور بھوک بانٹنے والے ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ اس دن چبوترے پر چڑھ کر اس نے چیخ کر کہا۔۔۔۔۔ ''حق داروں کو ان کا حق دو، ورنہ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔''(6)

اس افسانے میں رشید امجد نے پاکستان میں لگنے والے مارشل لاء کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اسے چوہے بلی کا کھیل گردانتے ہیں جس میں بلی ایوب خان اور چوہے مشرقی و مغربی پاکستان کی عوام ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مارشل لاء میں عوام چوہوں کی طرح خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے بلوں میں گھُس جاتے ہیں۔ مگر وہ چوہے جو اک بل سے دوسری بل میں گھُس کر سازشیں کرتے ہیں وہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ رشید امجد علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''پھر اس نے چوتھا خواب دیکھا کہ کچے مکانوں میں رہنے والے سب لوگ چوہے بن گئے ہیں اور بلوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ موٹی تازی بلی ان کے بلوں کے باہر غراتی پھر رہی تھی۔'' کسی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کو کب تک روکا جا سکتا ہے؟'' صبح اُٹھ کر اس نے خود سے کہا اور دوڑتا ہوا اپنے بل سے باہر نکل آیا۔ بلی غراتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔ وہ لپک کر دوسرے بل میں گھس گیا پھر سارے چوہے ایک بل سے دوسرے بل میں سے نکل کر دوسرے بل میں گھستے رہے۔ بلی بھاگ بھاگ کر ہانپنے لگی اور بے دم ہو کر گر پڑی۔''(7)

جب بلی کچھ نہ کر سکی اور معاشرتی بگاڑ قابو سے باہر ہو گیا۔ تو ایوب خان والا مارشل لاء یحییٰ خان کے دور میں ڈھل گیا۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''پھر اُس نے پانچواں خواب دیکھا کہ بھوک بانٹنے والے، کھیت کی منڈیر پر سر جوڑے بیٹھے ہیں۔ وہ دیر تک سر جوڑے سوچتے رہے، پھر انھوں نے پرانی بلی کو پکڑ کر ایک طرف

کر دیا اور اس کی جگہ اسی جیسی لیکن دوسری بلی لے آئے۔ اس کے بعد وہ کھیت میں آئے اور
انھوں نے بیچوں بیچ دیوار کھڑی کرنا شروع کر دی۔''(8)

دیوار سقوطِ ڈھاکا کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ جب پاکستانی اپنی زمین میں منافقت کے بیج بونے لگے تو نتیجتاً زمین میں دیوار اُگ آئی۔ منافقت دُنیا کا خطرناک ترین رویہ ہے۔ جب ہم کھیتوں سے اناج حاصل کر کے اپنی اولادوں کو کھلاتے ہیں اور خود کھاتے ہیں تو ہمارے وجود میں خون کی جگہ غیرت گردش کرتی ہے لیکن جب ہم کھیتوں میں منافقت اگائیں گے تو ہمارے اور ہماری اولادوں کے وجود میں منافقت ہی گردش کرے گی۔ عوام، حکمران، سیاستدان اور مذہبی رہنماؤں کے منافقانہ رویے سے مشرقی اور مغربی پاکستان الگ ہو گئے اور صرف پاکستان باقی رہ گیا۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''ایک دیوار کی ایک طرف رہ گیا اور دوسرا دوسری طرف۔ دونوں ایک دوسرے کو نفرت سے دیکھنے لگے۔۔۔۔ اگلے دن وہ سارا دن اداس رہا۔ اخباروں کی سیاہ سرخیاں گلیوں اور بازاروں میں چیختی چلاتی بین کرتی پڑھی جا رہی تھیں۔۔۔۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔''(9)

رشید امجد پاکستان کے دولخت ہونے کے منظر کو علامتی انداز میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:۔

''چھٹا اور ساتواں خواب اُس نے ایک ساتھ دیکھے۔۔۔۔۔ کشتی کے پیندے میں سوراخ ہو چکا تھا اور پانی رفتہ رفتہ، بہت ہی آہستگی سے اندر آ رہا تھا۔ پھر بپھرتا، ٹھاٹھیں مارتا دریا، یک دم خون کے دریا میں بدل گیا۔ کنارے پر کھڑا روشنی کا مینار لڑکھڑا کر کشتی پر آ گرا کشتی ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں، ادھ موئے، مرتے چیختے انسان۔۔۔۔۔ ٹوٹے ہوئے کاسے۔۔۔۔۔''(10)

سقوطِ ڈھاکا کے بعد جو پاکستان اور پاکستانیوں کی سبکی ہوئی اُسے رشید امجد علامتی انداز میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:۔

''ان کے ناموں کی دہائی دیتی یہ صبح جب شہر کے بڑے چوک میں اتری تو وہ ایک ایک کر کے اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکلے اور سر جھکائے اپنے اپنے کاموں پر چل دیے۔ کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ دوسرے کی طرف دیکھے یا یہ پوچھے کہ یہ رات اتنی گھنی سیاہ اور ڈراؤنی کیوں تھی۔''(11)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستانی قوم کو ایک جھٹکا ضرور لگا لیکن دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلے تو وقت نے پرانے زخموں کو بھر دیا اور پھر سے ساری قوم منافقت، سرمایہ داری اور مارشل لاء کی جانب بڑھنے لگی۔ ایک بار پھر مختلف حلقہ احباب کی منافقتوں کے اجتماع نے پاکستانی قوم کو جرنل ضیاءالحق کے مارشل لاء کی دلدل میں دھکیل دیا۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر شہر کی طرف دیکھا۔ مسجدوں کے گنبدوں، درس گاہوں کے دروازوں، کیفوں، ہوٹلوں، گھروں اور دفتروں، ہر چیز پر منافقت کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور منافقت کی چیلیں سارے شہر پر منڈلاتی پھر رہی تھی۔''(12)

رشید امجد کے افسانہ ''بے دروازہ سیر اب''اسی بحث کی کڑی ہے۔ مارشل لا کئی صعوبتیں اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جن میں زباں بندی پہلی صف میں کھڑی نظر آتی ہے۔ جب زباں بندی آئی اُسی دور میں علامت نے اُردو افسانے میں جگہ بنائی۔ یہ بات مان بھی لی جائے کہ ادیب سابقہ روایت سے اُکتا کر نئے تجربات کر رہے تھے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مارشل لاء کی زباں بندی نے علامتی ادب کے پروان چڑھانے میں راہیں ہموار کی ہیں۔ اس دور میں مختلف تجربات ہوئے کچھ ناقص لکھنے والوں نے لفظوں کو جوڑ کر کہانیاں بنانے کی کوششیں کی لیکن وہ ناکام رہے اور علامتی افسانے کے لیے ایک اعتراض کی صورت میں سامنے آئے ان افسانوں اور افسانہ نگاروں کے خلاف رشید امجد علامتی انداز میں کچھ یوں مزاحمت کرتے ہیں:۔

''ایک لمحے کے لیے خیال آتا ہے کہ کہانی کے بغیر ہی لفظوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر فرضی کہانی بنالی جائے۔ فرضی کہانی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لفظ کو دوسرے لفظ سے

جوڑتا ہے، لفظوں کا مینار اُٹھتا چلا جاتا ہے، جب آخری لفظ رکھتا ہے تو مینار دھڑام سے نیچے گر پڑتا ہے، کونے میں چھپی کہانی کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔''(13)

کہانی کے لیے کرداراور کردار کے لیے ماحول ضروری ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں مارشل لاء لگا ہو، زباں بندی عروج پر ہو، منافق چہرے رنگین نقابوں سے ڈھکے ہوں اور لوگ احساس سے عاری ہو کر روبوٹ بن گئے ہوں تو اصلی کرداروں تک پہنچنا خاصہ دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح زباں بندی میں یہ خوف سر پر لٹکتا رہتا ہے کہ نجانے کون سا جملہ حاکمین کو ناگوار گزرے اور کمر کوڑوں سے چھلنی ہو جائے۔ اس گھٹن، ڈر اور خوف کے ماحول میں بڑے کردار کہاں پلتے ہیں؟ اس لیے ایسے عہد میں کہانی لکھنا نہایت کٹھن اور مشکل امر ہوتا ہے۔ رشید امجد مارشل لا میں لگی زباں بندی اور گھٹن کے خلاف مزاحمت کے لیے ایک لکھاری کے جذبات کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔'' کیا ہوا۔۔۔۔ کیا ہوا؟''لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں وہ روتے روتے سر اُٹھا کر دیکھتا ہے، ٹوٹے بازو۔۔۔۔ پتھر کی آنکھیں۔۔۔۔ پیوند لگے سر، لکڑی کے پاؤں، وہ کتابوں کے ڈھیر میں اتر جاتا ہے۔ دیمک لگی تاریخ کے ایک ایک واقعہ کو ٹٹولتا ہے، اپنے وقت کے بڑے بڑے کردار تاریخ کے کوڑا گھر میں اوندھے پڑے ہیں، ہاتھ لگاتا ہے تو بُھر جاتے ہیں۔''(14)

رشید امجد اپنے افسانے ''کھلی آنکھ میں دھند ہوتی تصویر'' میں مارشل لاء کے لیے پت جھڑ کی بیمار رات کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس رات کی منظر کشی کچھ یوں کرتے ہیں:۔

''سردیوں کے پت جھڑ کی یہ رات، جس کی عمر معلوم نہیں سر جھکائے آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے۔ ننگی شاخوں سے لپٹے گھونسلوں میں دبکے پرندے گردن نکال کر چوری چوری اسے گزرتے دیکھتے اور اپنے پروں میں دبک جاتے ہیں۔ گھروں میں آتش دانوں کے آگے، بستروں میں بیتی کہانی، اس ایک جگہ رُکی ہے جہاں سے نہ تو واپس جانے کا کوئی راستہ ہے اور نہ آگے کچھ دکھائی دیتا ہے۔''(15)

مارشل لاء میں زباں بندی پر رشید امجد انسان اور مارشل لاء دونوں کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔مارشل لاء پر اس لیے کہ اگر سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے تو پھر زباں بندی کی کیا ضرورت ہے اور انسانوں پر اس لیے کہ وہ گونگے بن کر اپنی جان بچانے پر خوش ہیں جب کہ ایک کتا جسے معاشرے میں کمتر سمجھا جاتا ہے اپنے فرائض سے غافل نہیں ہے۔اگر یہاں غور کیا جائے تو انسان اشرف المخلوقات ہے اور کتا معاشرے کا کمتر جاندار۔اس مارشل لاء کے عہد میں انسان کا کام اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانااور کتے کا کام بھونکنا ہے لیکن انسان مارشل لاء کے خوف سے گونگا بن کر رہ گیا ہے لیکن کتا اپنی فطرت اور فرض کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو کر سکتا ہے کر رہا ہے۔رشید امجد لکھتے ہیں:۔

> ''الف اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔'' گونگے ہو؟'' الف سر ہلاتا ہے۔'' اور یہ۔۔۔'' وہ کتے کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔کتے کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ دو قدم ہٹ کر بھونکنے لگتا ہے۔پانچوں سر جوڑ کر ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں انڈیلتے ہیں، پھر ان میں سے ایک جو آگے ہے الف سے کہتا ہے۔۔'' جاؤ۔۔۔۔فوراً بھاگ جاؤ'' الف دبک کر اپنے گھر میں رینگ جاتا ہے۔پھر وہ کتے کی طرف دیکھتے ہیں، جو ابھی تک بھونک رہا ہے اور ان پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔وہ اپنی بندوقیں سیدھی کرتے ہیں۔۔۔۔تڑتڑ۔۔۔۔تڑتڑ کتے کی غراہٹ سسکیوں میں ڈوب جاتی ہے۔''(16)

رشید امجد کا افسانہ ''چپ صحرا'' کا موضوع مارشل لاء کے ادباء، اُن کی صعوبتیں، خاص طور پر زباں بندی اور معاشرے کے اجتماعی لاشعور میں پائی جانے والی دقیانوسیت ہے۔کسی بھی معاشرے کی تربیت میں استاد، ممبر پر کھڑے امام اور ادباء کا عمل دخل ہوتا ہے۔یہ معاشرے کی اچھی اقدار اور روایات کے پاسدار بھی ہوتے ہیں اور ان روایات و اقدار کو اگلی نسل میں منتقل کرنے کے ذمہ دار بھی۔بصد افسوس کہ ہمارے یہاں زیادہ تر اساتذہ، مولوی اور ادباء اپنا کام بھول کر فکرِ معاش میں غرق ہیں۔بس وہی پاٹ پڑھاتے ہیں جس سے وہ خود سکھی رہ سکیں۔یہ سکھ جسمانی بھی ہو سکتا ہے اور معاشی بھی۔ایسے ہی ادباء کے بارے میں رشید امجد اس افسانے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:۔

''میں نے سُنا تھا کہ سانپ نے حضرت سلیمانؑ سے یہ عہد کیا تھا کہ کسی لکھنے والے کے کمرے میں نہیں جائے گا۔اب یاتواُس عہد کا عرصہ ختم ہو گیا ہے یاسانپ نے بد عہدی کی ہے، یاحضرت سلیمانؑ نے ہی اجازت دے دی ہے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ سانپ لکھنے کی میز پر بیٹھا ہے اور میں کونے میں کھڑا ہوں۔اب شاید میں رینگ رینگ کر باہر نکل جاؤں گااور سانپ میری جگہ لکھنے کا کام کرے گا۔''(17)

معاشرے کے اعصاب درست رکھنے والے اساتذہ، مولوی،ادیب اور صحافیوں کی بدولت عوام ایسی فرسودہ روایات سے جڑ چکی ہے جو روایات نہیں بلکہ توہمات ہیں۔ جہاں ان حضرات کا کام عوام کو اچھی اقدار سے جوڑے رکھنا ہے وہاں انھیں نئی پنپنے والی اقدار سے روشناس کرانا بھی ہے۔اسی طرح عوام تن آسانی اور ذہن آسانی میں اتنی غرق ہے کہ وہ دوسری اقوام کی طرح آگے بڑھنے کی بجائے رفتہ رفتہ پتھر کے دور کی جانب بڑھ رہی ہے۔رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''گھڑیاں اُلٹی چلنے لگی ہیں۔لوگ خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے ہیں۔ میں نے چیخ کر کہا کہ یہ برے وقت کی دلیل ہے،اس پر ماتم کرو۔لیکن میری بات سننے کی بجائے لوگوں نے اُلٹا مجھے لعن طعن شروع کر دیا ہے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور اب صورتحال یہ ہے کہ گھڑیاں مسلسل پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہیں اور ہم صدی صدی پیچھے چلے جا رہے ہیں۔چند دنوں میں ہم پتھر کے زمانے میں داخل ہو جائیں گے۔''(18)

زباں بندی کسی بھی عہد میں لگائی جاسکتی ہے خاص طور اُس وقت جب حاکم وقت یہ بھول جائے کہ وہ ایک جمہوری حکومت کا سربراہ ہے نہ کہ بادشاہ۔ ہمارے ادباء نے مارشل لاءاور زباں بندی کے مختلف ادوار گزارے ہیں۔ جن ادباء نے اپنے فرائض اور اپنے ضمیر کی آواز کو فراموش نہیں کیااُن کو سخت جسمانی اور ذہنی تکالیف میں بھی مبتلا رہنا پڑا۔انھیں قید خانوں کی تعفن زدہ صعوبتوں کا بھی سامنا رہااور ان کے جسموں پر کوڑے بھی برسائے گئے۔زباں بندی میں زباں کھولنے یااپنے قلم سے جرأت کا کام لینے والے ادباء کا عوام نے بہت کم ساتھ دیا بلکہ اُن کے خلاف گواہیاں دی۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ جہاں مذہب کی بات آتی ہے وہاں

اندھی تقلید شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ مذہب خود تحقیق کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر اندھی تقلید ان لیے اطمینان بخش ہے کیوں کہ اُس میں محنت کی دقت نہیں ہوتی۔ رشید امجد عوام کی بے حسی کو کچھ یوں رقم کرتے ہیں:۔

''جناب عالی یہ واقعہ نہ تو میرے سامنے ہوا ہے اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں کوئی ذاتی علم ہے، لیکن میں مفادِ عامہ کے لیے یہ گواہی دینے حاضر ہو گیا ہوں۔ جناب میں اس شخص کو ذاتی طور پر نہیں جانتا، لیکن میں نے سُنا ہے کہ یہ لفظوں کی حرمت پر یقین رکھتا ہے اور کھلم کھلا ہمارے خیالات کی نفی کرتا ہے۔ ایسا شخص معاشرے کے لیے انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ آزادیٔ اظہار کی بات کرتا ہے۔ آپ ہی بتائیے جناب والا یہ بھی کوئی کرنے کی بات ہے۔''(19)

رشید امجد مزید لکھتے ہیں:۔

''دوسرے گواہ نے حلف اُٹھانے کے بعد کہا۔۔۔۔۔ جناب والا! میں پہلے معزز گواہ کی تائید کرتا ہوں، اس شخص کو ایک لمحہ کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ دیکھیں نا جناب یہ شخص ہمیں آئینہ دکھانا چاہتا ہے، احمق کہیں کا۔ ہمیں ہماری روایات سے توڑنا چاہتا ہے۔ میں بھی اگرچہ ذاتی طور پر اس کے گناہوں سے آگاہ نہیں لیکن جناب والا میں کارِ خیر کے طور پر گواہی دینے آیا ہوں۔۔۔۔''(20)

رشید امجد کا یہ افسانہ ''بنجر لہو منظر'' مارشل لاء اور اُس کی پابندیوں کے خلاف شدید مزاحمت کرتا ہے۔ مارشل لاء لگائے جانے کی خبر عوام تک اچانک پہنچتی ہے اور اُس کے بعد اس کے اُٹھائے جانے کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جرنل ضیاء الحق کا لگایا گیا مارشل لاء عوام اور ادباء کے لیے کٹھن ترین مارشل لاء تھا۔ اس میں مذہب کی آڑ میں کئی پابندیاں لگائی گئیں، زباں بندی ہوئی اور سوچوں پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ کلاشن کوف کلچر، برادری اِزم اور طالبان اسی عہد کی دین ہیں جن کا خمیازہ آج پاکستانی عوام بھگت رہی ہے۔ رشید امجد نے مارشل لاء کے لیے ایسی رات کی علامت استعمال کی ہے جو سانپ کی طرح کنڈل مار کر بیٹھی ہے۔ آمریت کے رکھوالوں کے

لیے کتے اور سوّر کی علامت استعمال کی گئی ہے۔ عوام کی نمائندگی مرکزی کردار نے کی ہے۔ جب کہ مذہبی منافقتوں پر میاں بیوی کے رشتے کے ذریعے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''وہ چادر ہٹا کر سر اندر کرتا ہے۔۔۔''اپنے گھر میں، اپنی چادر کے نیچے بھی تم اپنی بیوی کے سارے جسم کو نہیں دیکھ سکتے۔''(21)

رشید امجد مارشل لاء میں زباں بندی اور سوچوں پر لگے پہروں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''میں اپنے گھر میں، اپنے کمرے میں، اپنے بستر پر چادر اوڑھے لیٹا ہوں، اس شہر میں اب انسانوں پر دوسرے حکومت کرتے ہیں، اس لحاظ سے اسے ان کا شہر کہنا مناسب ہوگا، ان کا خیال ہے انسان شعور سے عاری ہیں اس لیے انھیں شعور سکھانے کے لیے یہ انتظام ضروری ہے۔ وہ چادر کا کونا ہٹا کر سر اندر کرتا ہے۔۔ تمھیں معلوم نہیں کہ چادر کے نیچے بھی سوچنا منع ہے۔ چابک کی سر سراہٹیں سارے کمرے میں گونجنے لگتی ہیں۔''(22)

رشید امجد مارشل لاء کی آمد کو علامتی انداز میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:۔

''میں غلام ابن غلام ابن غلام حاضر ہوں۔۔۔۔اور میرے بچے، ان کا قصور صرف یہ ہے کہ میرے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔۔۔۔ اس شہر میں پیدا ہوئے ہیں۔۔۔۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں کتے تازہ خون کی مہک سونگھتے پھر رہے ہیں، کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا وہ ایک بٹن آف کرتا ہے، ریڈیو، ٹی وی، اخباروں اور رسالوں میں گونجتی آوازیں، تصویریں اور خبریں ایک لمحے میں غائب ہو جاتی ہیں، چہرے، شکلیں پلک جھپکنے میں گم ہو جاتی ہیں۔ وہ ہنستا ہے۔۔۔۔ ہنستا ہی چلا جاتا ہے۔۔۔ صرف ایک بٹن آف کرنے کا وقفہ ایک پورے کا پورا دور ختم ہو گیا، بس اتنی سی بات وہ دوسرا بٹن آن کرتا ہے۔ ایک لمحہ میں ریڈیو، اخباروں اور رسالوں میں نئی آوازیں، نئی خبریں، ٹی وی کی سکرین پر ایک ہی پل میں پرانی تصویر کی جگہ نئی تصویر۔''(23)

مارشل لاء میں ہونے والی آدمیت کی تذلیل کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہوئے رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''چبوترے پر پیچھے ہاتھ بندھے شخص کو لایا جاتا ہے۔ فردِ جرم پڑھی جاتی ہے۔ یہ شخص سر اُٹھا کر چلتا ہے۔ فیصلہ۔۔۔ اس کا منہ کالا کرتے ہیں، پھر تالیاں بجاتے نعرے لگاتے ہیں۔''ابو! انسان بہت عظیم ہے نا''''شاید ہے، یا پھر شاید نہیں ہے۔''''کیا مطلب؟ ''شاید کسی جگہ ہوتا ہوگا، کسی جگہ نہیں ہوتا ہوگا۔''(24)

مارشل لاء کے دوران میں ہونے والی ناانصافیوں اور سفاکیوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''زمین پیاس سے ہانپ رہی ہے۔ بہتر آدمی سینہ تانے، دیوار بنے میدان میں ڈٹے کھڑے ہیں، وہ غرّاتا ہے، نیزے پر ٹنگے ہوئے سر کو دیکھ کر غرّاتا ہے پنجے مارتا، ہوا سونگھتا ہے، عورت برف سر اوپر اُٹھاتی ہے۔۔۔''اب اجازت ہے کہ بیٹے کی لاش سولی سے اتار لوں۔''(25)

رشید امجد نے اپنے افسانے ''بیکسئی پرواز'' میں مارشل لاء کی گھٹن کو علامتی انداز میں کچھ یوں درج کرتے ہیں:۔

''ادھر بلا اسی طرح شہر کی فصیل پر بیٹھی آنے جانے کے راستے روکے ہوئے ہے۔ نہ کوئی شہر میں آتا ہے نہ جاتا ہے۔ تازہ ہوا کے سارے جھونکے مقید ہو چکے ہیں اور شہر مدتوں سے باسی فضاؤں میں سانس لے رہا ہے۔''(26)

انسان اُس وقت تک نہیں ہارتا جب تک وہ اپنی شکست تسلیم نہ کرلے۔ رشید امجد نے اس افسانے میں شہر کی علامت پاکستان کے لیے استعمال کی ہے جس پر مارشل لاء کسی بلا کی طرح مسلط ہے۔ وہ پاکستانی عوام کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں کہ انھوں نے اس بلا یعنی مارشل لاء کی پابندیوں میں جینا سیکھ لیا ہے۔ وہ اپنا نصیب بدلنے کی کوشش کی بجائے اسی پر راضی ہو چکے ہیں۔ وہ اس حد تک ہمت ہار چکے ہیں کہ انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا مارشل لاء ہو یا نہ ہو۔ انھوں نے شاید اپنے تئیں کوشش کر کے دیکھ لی ہے اور اب وہ یہی سوچتے ہیں کہ اب کچھ نہیں بدلنے والا۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''میں اسے اپنی بات نہیں سمجھا سکتا، میں تو اپنی عمر کے لوگوں کو بھی اپنی بات نہیں سمجھا سکتا۔ وہ بھی کہتے ہیں۔۔۔۔''بلا ہے تو سہی لیکن ہم کیا کریں۔ ہم سے پہلے والے بھی یوں

ہی رہ کر چلے گئے، ہم بھی چلے جائیں گے۔ بس یہ دنیا تو فانی ہے، ایک آتا ہے دوسرا جاتا ہے۔ایسے چل چلاؤ میں بلا کیا اور بلا کا نہ ہونا کیا۔''(27)

ایک اور جگہ مارشل لاء کے خلاف اور ایسے لوگوں کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''شہر والوں کے وجود میں پتھر اُگنا شروع ہو گئے ہیں۔پہلے پاؤں کا انگوٹھا پتھر بنا پھر آہستہ آہستہ سارے وجود میں پھیلنے لگا اور اب سار شہر نصف دھڑ کے ساتھ سوچتا ہے، حرکت نہیں کرتا۔''(28)

کسی معاشرے کے باسیوں میں اجتماعی سوچ کا ہونا اُس معاشرے کے لیے نعمت ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ہر شخص نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی ہوئی ہے۔ وہ دوسروں کے بارے میں یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ ملک و ملت کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہیں لیکن جب اُس کی اپنی باری آتی ہے تو اُس کے اصول بدل جاتے ہیں۔آزادی قربانی کی متقاضی ہے۔ جیسے اس افسانے میں روایت کے مطابق مقابلہ کرنے والے چھے میں سے کسی ایک کو مرنا ہے۔جب تک بات چھٹے کی ہوتی ہے تو وہ پانچوں چھٹے کو بڑے زور و شور سے ڈھونڈتے ہیں۔رات گئے تک غور کرتے ہیں لیکن جب انھیں معلوم پڑتا ہے کہ چھٹا اُن کے اپنی اولاد میں سے ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ان کے سارے جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں کہ شہر میں تازہ ہوا مقید ہو کہ رہ گئی ہے یا شہر تعفن زدہ ہو گیا ہے۔اس موقع پر چھٹا مل چکا ہے۔اب بلا سے مقابلے کا وقت ہے لیکن وہ قربانی دینے کو تیار نہیں ہیں۔رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''کوئی بلا کا ذکر نہیں کرتا۔۔۔۔لیکن بلا شہر کی فصیل پر موجود ہے۔آنے جانے کے راستے بند ہیں۔تازہ ہواؤں کو بھولا ہوا شخص اندر ہی اندر گل سڑ رہا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے ہمارا کیا بنے گا؟ یہ بلا کب تک یونہی شہر کی فصیل پر بیٹھی رہے گی ؟کوئی میرے اندر سرگوشی کرتا ہے۔۔۔جب تم اپنے بیٹے کی بات مان لوگے۔مجھے اسی خیال سے جھر جھری آجاتی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کسی دن میں مان ہی جاؤں۔۔۔۔ لیکن کب؟''(29)

رشید امجد اپنے اس افسانے ''سکرپٹ''میں آئین پاکستان میں ہونے والی تبدیلیوں اور پاکستانی عوام کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔ سکرپٹ آئین پاکستان کی علامت ہے جس سے جرنیلوں نے سب سے پہلے بے وفائی کی۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمیں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ حکومت آئین کے مطابق چل رہی ہے، اس میں کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں یا نہیں۔ بلکہ جب مارشل لاء لگتا ہے تو عوام تالیاں بجاتے ہوئے جرنیلوں کو خوش آمدید کہتی ہے اور جب کسی جرنیل کے زوال کے بعد کوئی سیاست دان آتا ہے تو بھی لڈو بانٹے جاتے ہیں۔آئین میں تبدیلیاں صرف جرنیل ہی نہیں کرتے بلکہ ہمارے ہاں سیاستدان بھی کرتے ہیں۔ عوام جاہلوں کی طرح ہر ہونے والی تبدیلی کو کھیل کا ضروری حصہ جانتے ہوئے خوش ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی سے کئی نئی اُمیدیں وابستہ کر لیتی ہے۔ ہماری عوام کیوں کہ خوشامدی ہو چکی ہے اور سب نے اپنے اپنے آقا چن لیے ہیں اس لیے اُن کے آقا جو بھی کریں صحیح یا غلط ان کا کام ان کے کیے پر تالیاں بجانا اور واہ واہ کرنا ہے۔ پاکستان کے آئین کے ساتھ کئی بار چھیڑ چھاڑ کی جا چکی ہے اس میں شک نہیں کہ اچھی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں لیکن زیادہ تر تبدیلیاں اپنے اپنے مفادات کی خاطر کی گئی ہیں۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

> ''جب ان کو سکرپٹ کی اہمیت ہی نہیں معلوم ''ایک اداکار نے دوسرے سے کہا۔۔۔''تو سکرپٹ کے بغیر ہی چلو'' ''لیکن کب تک'' دوسرے نے تشویش سے پوچھا۔''جب تک چلے''پہلے نے جواب دیا۔''(30)

رشید امجد نے اس افسانے ''سکرپٹ''میں مختلف علامتیں استعمال کی ہیں جن میں سکرپٹ آئین پاکستان کی علامت ہے۔ سکرپٹ سے بے وفائی کرنے والے اداکار وہ فوجی آمر اور سیاست دان ہیں جنھوں نے اس میں اپنے مفادات کے لیے تبدیلیاں کی ہیں۔ سٹیج پر کام کرتے اچھے برے اداکار سیاست دانوں کی علامت ہیں اور ہر اچھی یا بری تبدیلی پر تالیاں پیٹنے والے عوام کی علامت ہیں۔

''گملے میں اگا ہوا شہر'' ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور اُن کے جنازے کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی مقبولیت کے باعث اُن کے جنازے میں لوگوں کو شرکت کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔اُن کے چند قریبی رشتہ داروں نے اُن کا جنازہ ادا کیا اور انھیں گڑھی خدا بخش میں سپردِ خاک کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو کئی بار تختہ دار تک لانے کی کوششیں کی گئیں۔ پہلی بار ذوالفقار علی بھٹو کو پیپلز پارٹی کے رہنما احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد قصوری کے قتل کے مقدمے میں گرفتار کیا گیا۔ محمد احمد قصوری کو ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو اُس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ ایک شادی کی تقریب سے فارغ ہو کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھر جا رہے تھے۔ ایف اسی ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود نے وعدہ معاف گواہ بنائے جانے کے وعدے پر بیان دیا کہ یہ قتل ایف ایس ایف کے اہلکاروں نے کیا تھا اور انھیں اس کا حکم خود سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے دیا تھا، تین ستمبر ۱۹۷۷ء کو بھٹو کو اس قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا مگر دس دن بعد تیرہ ستمبر ۱۹۷۷ء کو لاہور ہائی کورٹ کے جج جسٹس کے۔ایم۔اے صمدانی نے انھیں ضمانت پر رہا کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی ضمانت پر رہائی جنرل ضیاالحق اور ان کے رفقا کو سخت ناگوار گزری، ان دنوں جنرل اقبال پنجاب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے، انھیں اس بات پر جنرل ضیاالحق کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا کہ انھوں نے بھٹو کو رہا کیوں ہونے دیا اور اگر عدالت نے ضمانت منظور کر لی تھی تو انھیں کسی اور مقدمے میں گرفتار کیوں نہیں کر لیا گیا۔

ضمانت پر رہائی کے بعد بھٹو نے ملتان میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کیا اور کراچی روانہ ہو گئے۔ انھوں نے کراچی میں بھی ایک بڑے جلسے کا علان کر دیا تھا، مارشل لاء حکومت اور فوجی حکام کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہو گیا، اس دفعہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو مارشل لاء کے ضابطہ نمبر بارہ کے تحت گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، تا کہ کسی اپیل، دلیل اور وکیل کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے اور کوئی عدالت ان کی ضمانت نہ لے سکے، نئی منصوبہ بندی کے تحت ان کی گرفتاری سترہ ستمبر ۱۹۷۷ء کو عمل میں لائی گئی، یہ

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی آخری نظر بندی تھی جو ان کی موت تک مختلف صورتوں سے قید میں تبدیل ہوتی رہی۔(31)

بھٹو کو گرفتار کر کے پھانسی تک لے جانے کی کوششوں کو رشید امجد نے کچھ یوں بیان کیا ہے:۔

> ''وہ پچھلے کئی مہینوں سے یہ قبر کھود رہے تھے۔۔۔۔۔ کبھی نیچے سے دلدل نکل آتی اور کبھی آسمان پانی بن جاتا۔ قبر کھودنے کے دوران انھیں معلوم ہوا، اندر ہی اندر شہر کی زمین دلدل اور آسمان پانی ہو چکا ہے مگر انھیں ہر صورت میں قبر کھودنا تھی اور قبر کھد چکی تھی۔ وہ مٹی کے ڈھیر کے پاس بیٹھے ستا رہے تھے۔''(32)

ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے مقبول ترین راہنما تھے۔ جنرل ضیاء الحق اور اُن کے حواریوں کو اس بات کا شدید خوف تھا کہ اگر عوام کو ذوالفقار علی بھٹو کا جنازہ پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے تو عوام جذبات میں آ کر اُن کا سارا کھیل بگاڑ سکتی ہے اس لیے اُن کے جنازے کو محدود کر دیا گیا۔ رشید امجد جس جنازے کے گم ہونے کا ذکر کر رہے ہیں اُسے محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی سوانح عمری میں کچھ یوں رقم کیا ہے:۔

> ''ممی کی دی نیند کی وولیم گولیوں کے باوجود ٹھیک دو بجے میری آنکھ کھل گئی اور میں زور سے چلائی۔ نو۔ نو۔۔ میری سانس رک رہی تھی۔ جیسے کسی نے میرے گلے میں پھندا پہنا دیا ہو۔ پاپا، پاپا۔ میرے منھ سے بس یہی نکل رہا تھا۔ سخت گرمی کے باوجود میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ 'چند گھنٹوں کے بعد سینٹرل جیل کے اسسٹنٹ جیلر اس گھر میں گئے جہاں نصرت اور بے نظیر بھٹو کو نظر بند کیا گیا تھا۔ اسے ملتے ہی بے نظیر کے پہلے الفاظ تھے 'ہم وزیر اعظم کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں۔ جیلر کا جواب تھا 'انھیں تدفین کے لیے لے جایا جا چکا ہے۔ بے نظیر لکھتی ہیں مجھے لگا جیسے کسے نے مجھے گھونسا مارا ہو۔ میں نے چلا کر کہا آپ انھیں ان کے اہل خانہ کے بغیر تدفین کے لیے کیسے لے جا سکتے ہیں؟''(33)

رشید امجد نے پاکستان کے لوگوں کی محدود سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے اس ملک کے لیے گملے میں اُگے ہوئے شہر کی علامت تراشی ہے۔ رشید امجد کے افسانے گملے میں اگا ہوا شہر۔۔۔۔ میں بھی ایک جنازہ گم ہو جاتا ہے لیکن وہ انسانیت کا جنازہ ہے۔ گملا محدود ہوتا ہے، اُس میں لگے پودے کی جڑیں محض ایک خاص حد تک

بڑھ سکتی ہیں وہ اپنے دائرے سے تجاوز نہیں کر سکتیں اسی طرح گملے میں لگے پودے کی قد و قامت بھی ایک جگہ پر آکر رُک جاتی ہے۔ایسے ہی پاکستان کے لوگ اُس گملے میں اُگے ہوئے پودے کی طرح ہیں جو اپنے مقبول ترین لیڈر کو بچانے کے لیے اس دائرے سے باہر نہیں آئے اور وہ جوان کی جنگ لڑتا لڑتا سولی پر لٹکا دیا گیا۔

رشید امجد پاکستانیوں کو بھیڑیوں سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ بھیڑیوں کو جب کھانے کے لیے کوئی شکار نہیں ملتا تو وہ ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتے ہیں اُن میں سے جسے بھی تھک کر اونگھ آتی ہے دوسرے اُس پر جھپٹ پڑتے ہیں اور چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔اسی افسانے کا آخری اقتباس اسی روایت کی جانب اشارہ دیتا ہے۔رشید امجد لکھتے ہیں:۔

> ''شک ان کے بدنوں کے ادھڑے بوسیدہ دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔خالی منظر ان کی بوڑھی نظروں کو نوچ رہا ہے۔ بھوک ان کی انتڑیوں کو بل دے رہی ہے۔۔۔اور ایسے میں وہ سب، سب کے سب، ان میں سے ہر کوئی، وحشت زدہ آنکھیں پھاڑے کسی دوسری آنکھ کے جھپکنے کا منتظر ہے کہ کھدی ہوئی قبر تو بس لاشیں مانگتی ہے۔''(34)

''سناٹا بولتا ہے'' رشید امجد کا ایک زبردست مزاحمتی اور علامتی افسانہ ہے۔مارشل لاء کسی ایک آدمی کی حکمرانی کی خواہش کے علاوہ دوسری طاقتوں کے لیے بھی سود مند ہوتا ہے۔مارشل لاء لگا دینے سے آئین معطل ہو جاتا ہے اور بادشاہت شروع ہو جاتی ہے۔جمہوری حکومت میں کسی قسم کی اصلاحات لانے کے لیے قانون سینٹ اور قومی اسمبلی سے پاس ہو کر قانون کی صورت اختیار کرتا ہے لیکن مارشل لاء میں کوئی بھی قانون ایک میز پر بیٹھے چند باوردی اشخاص واضح کر کے عوام پر لاگو کر دیتے ہیں۔جمہوریت کا یہ حُسن ہے کہ اُس میں نئے آنے والے قانون کی اچھائیوں، برائیوں کی اچھے سے چھانٹ پھٹک کی جاتی ہے۔وہی قانون سامنے آتے ہیں جو ملک قوم کی بقاء کے ضامن ہوں لیکن مارشل لاء میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔بس مقصد حاصل کرنے کے لیے قانون بنا دیا جاتا ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت اور مارشل لاء میں کوئی خاص فرق نہیں۔جمہوری حکومتیں ملکی مفاد کی بجائے وہ قانون بناتی ہیں جو اُن کے اور اُن کے لیڈر کے لیے فائدہ مند ثابت

ہو سکیں۔ مارشل لاء ہو یا جمہوری حکومت ان کے کیے گئے فیصلوں کا صلہ اس ملک کی عوام برداشت کرتی ہے۔ پاکستانیوں کی بے بسی کو رشید امجد علامتی انداز میں کچھ یوں رقم کرتے ہیں:۔

> ''ایک آواز۔۔۔'' میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں؟'''' دوسری آواز۔۔۔'' وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔'' تالیاں، نعرے، تحسین کا شور۔ وہ کہتا ہے۔'' بادشاہ نے بادشاہ کے ساتھ جو سلوک کرنا تھا کر دیا مگر ہم کہاں ہیں؟'' ''ہم۔۔۔۔'' میں اس کا شانہ تھپتھپاتا ہوں۔۔۔۔'' بادشاہوں کے کھیل میں ہم کوئی چیز نہیں ہوتے بس ہم تو کھلے مین ہول کے خواب ہی دیکھتے ہیں۔''(35)

رشید امجد لکھتے ہیں:۔

> ''شاید ایک دو یا اس سے بھی زیادہ دن، مہینے یا سال، یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم کب سے گٹر کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں، اتنا سا خیال آتا ہے کہ ہم گفتگو کرتے چلے جا رہے تھے۔ مین ہول کھلا ہو گا، وہ گرا، اسے نکالنے کی کوشش میں یا شاید میں گرا ہوں گا اور مجھے نکالنے کی کوشش میں وہ، پورے یقین کے ساتھ کوئی بھی بات نہیں کی جا سکتی۔''(36)

رشید امجد رقم طراز ہیں:۔

> ''وہ کہتا ہے۔۔۔۔۔ لو جی میں سمجھتا تھا میرا باپ مجھ سے اچھا تھا، اب معلوم ہوا وہ بھی میری طرح ساری عمر کھلے مین ہول کے خواب دیکھتا رہا۔''(37)

زباں بندی مارشل لاء کا پہلا اصول قرار پاتی ہے، لیکن اسے محض مارشل لاء کے کھاتے میں ڈال دینا درست نہیں۔ ہماری جمہوری حکومتیں بھی زباں بندی کی شدید رسیا ہیں۔ مارشل لاء میں زباں بندی کوڑوں سے عائد کر دی جاتی ہے اور جمہوری حکومتوں میں روپوں سے، تحائف سے یا پھر پلاٹوں کی فرد ملکیت اور لفافوں میں لپیٹ دی جاتی ہے۔ رشید امجد اسی زباں بندی کو علامتی انداز میں کچھ یوں پیش کرتے ہیں:۔

''میں نے جھک کر دیکھا سب کے منہ پر پلاسٹک ٹیپ لگے ہوئے ہیں، کیڑے ان کا گوشت کھا گئے ہیں مگر ٹیپ اسی طرح ہے۔'' مگر ہم تو اظہار کے حوالہ سے ہی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، اور ان کے منہ تو بند ہیں۔۔۔۔۔ بند کر دیے گئے ہیں۔''(38)

زباں بندی پر رشید امجد مزید لکھتے ہیں:۔

''شاید اوپر صبح ہو چکی ہے۔'' میں بڑبڑاتا ہوں۔'' مگر ہمیں کیا؟'' اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے۔'' سورج کی شکل کیسی ہو گی؟'' میں اس سے پوچھتا ہوں۔۔۔۔۔۔'' اس کی کرنوں میں گرمی تو ہوتی ہو گی نا'' ''اب تو یاد نہیں۔۔۔۔۔ اور میرے منہ پر تو ٹیپ لگا ہوا ہے اور ایسی باتیں کرنا منع بھی ہے، میں تمھیں کیسے بتاؤں، کیا بتاؤں۔''(39)

انسان ترقی یافتہ ہو چکا، مان لیتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ گٹر ہی سہی لیکن ساری دُنیا نہیں۔ اقوام عالم میں کئی ایسی اقوام ہیں جنھوں نے وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا سیکھ لیا ہے اور آج وہ ترقی کی معراج پر ہیں مگر یہاں انسانیت کے سارے فلسفے ماند پڑ جاتے ہیں جب ان اقوام سے اجارہ داری اور منافقت کے نشے کی بُو آنے لگتی ہے۔ ۷۰ء کی دہائی میں امریکہ نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ قرار دیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اگر اسرائیل کے گردونواح میں مسلم دُنیا کی آبادی تیزی سے بڑھتی رہتی تو اسرائیل اقلیت میں آسکتا تھا۔ اس لیے امریکہ میں ۲۲ نکات پر مبنی ایک رپورٹ تیار کی گئی جس کا نام ''آر ایس ۲۲ رپورٹ'' رکھا۔ اس رپورٹ میں اُن سارے نکات کو موضوعِ بحث لایا گیا جن کے ذریعے مسلم دُنیا کی آبادی قابو میں لائی جا سکتی تھی۔ اس رپورٹ میں لکھا گیا کہ ان پر زیادہ تر فوجی آمروں کی حکومت ہونی چاہیے تاکہ پالیسی پر عملدرآمد کرنے میں آسانی ہو۔ اس رپورٹ میں یہ بھی شامل تھا کہ ان ملکوں کو ایسے بیج بیچے جائیں جن سے اُگنے والی فصلیں ان کی بڑھتی آبادی میں رکاوٹ پیدا کر سکیں۔ یہ بھی لکھا گیا کہ ان ممالک میں منصوبہ بندی کی مہم چلائی جائیں اور منصوبہ بندی کے لیے استعمال میں آنے والے ذرائع مفت فراہم کیے جائیں۔ اگر باقی نکات سے صرف نظر کر کے صرف ان تین نکات کو دیکھا جائے تو ہمارے ملک میں یہ عملدرامد ہوئے ہیں۔ آج ہمارے کسان کے پاس اپنا بیج نہیں وہ بیج خریدتا ہے

اور کھیت سینچتا ہے، میڈ یا پر بچے دو ہی اچھے کی تبلیغ زمانہ دراز سے جاری ہے اور دیگر ذرائع جن کا رشید امجد نے ذکر کیا ہے مفت دستیاب ہیں۔انھیں خدشات پر رشید امجد لکھتے ہیں:۔

> ''صبر کرو۔۔۔۔۔صبر''میں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں۔۔۔۔''سارے بچے اب اسی طرح بہتے ہوئے یہیں آئیں گے کہ اب ساری مائیں اپنے بچوں کو یوں ہی نالیوں میں بہائیں گی''''نالیوں میں کیوں؟''وہ چپ ہو کر سوال کرتا ہے۔''دریا تو سارے خشک ہو گئے ہیں اور شہر میں قتلِ طفلاں کی منادی بھی ہو چکی ہے مائیں بیچاری کیا کریں۔''(40)

رشید امجد مزید لکھتے ہیں:۔

> ''مگر تم کون ہو؟''''ہم۔۔۔۔ہم ربڑ کے غباروں میں پیدا ہوئے ہیں اس گٹر کے اندر''
> ''ربڑ کے غبارے؟''''ہاں وہ غبارے جو لوگ استعمال کر کے گٹر میں پھینک دیتے ہیں۔''(41)

رشید امجد نے اس افسانے میں نہایت عمدہ علامتیں تراش کر مارشل لا اور جمہوریت کے ہمارے معاشرے پر پڑنے والے اثرات کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ وہ ہمارے ملک کے لیے گٹر کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ وہ مزاحمت کرتے ہیں کہ جس تعفن، گھٹن اور اندھیرے میں ہم جی رہے ہوں وہ زندہ انسانوں کا معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اس قدر غلیظ ہے کہ وہ اسے ملک، شہر یا معاشرہ نہیں بلکہ گٹر کہتے ہیں۔ رشید امجد کے اس افسانے میں کھلے مین ہول کی علامت بار بار استعمال ہوئی ہے۔ جہاں سے گٹر کا ڈھکن کھلا ہو وہاں سے لوگ اس کے اندر گر کر زخمی ہوتے ہیں یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔اسی طرح اگر کوئی گٹر میں کھڑا ہو تو کھلے مین ہول نظر آنے سے اُسے باہر نکلنے کا راستہ معلوم ہو جاتا ہے اور وہاں سے نکل کر وہ دوبارہ زندگی میں آسکتا ہے۔ اس علامت کے دو پہلو ہیں ایک تاریک اور دوسرا روشن۔ کھلا مین ہول راہنما کی علامت ہے۔ ایک بُرا راہنما کسی قوم کو گٹر میں دھکیل دیتا ہے جب کہ ایک اچھا رہنما قوم کے لیے روشنی، تازگی اور زندگی کی راہیں کھول دیتا ہے۔ یہ پاکستان کی ستم ظریفی ہے کہ اس کی عوام مدتوں سے گٹر کے اندر ہے اور اپنے کھلے مین ہول کے خواب دیکھ رہی ہے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔۔۔۔۔''میری عمر چالیس سال ہونے والی ہے۔ اس سیلن زدگی، رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور اس لیس دار اندھیرے کے جبڑوں میں پستے پستے چالیس سال ہو چکے ہیں، معلوم نہیں میری زندگی کے اور کتنے سال باقی ہیں، ان باقی سالوں میں کھلا مین ہول ملے گا بھی کہ نہیں۔''(42)

رشید امجد کا افسانہ ''پت جھڑ میں خود کلامی'' مارشل لاء کے خلاف مزاحمت کا علامتی اظہار ہے۔ مارشل لاء میں جب کرفیو ہوتا ہے تو پابندیاں اس قدر سخت کر دی جاتی ہیں کہ زندگی جامد ہو کر رہ جاتی ہے۔ لوگوں کو اپنے گھروں کے راشن کے لیے چند گھنٹوں کی چھوٹ دی جاتی ہے اور بعض اوقات وہ بھی نہیں۔ رشید امجد نے اس افسانے میں مارشل لاء کو مزاحمت کرنے کے لیے پت جھڑ کی علامت استعمال کی ہے۔ پت جھڑ از خود اُداسی کی علامت ہے۔ اس میں درختوں سے ایک ایک کر کے پتے جھڑتے ہیں اور رفتہ رفتہ درخت گنجے ہو جاتے ہیں۔ رشید امجد کے مطابق پت جھڑ کے باعث جھڑنے والے پتے وہ خواب ہیں جو مارشل لاء کی پابندیوں کے باعث آہستہ آہستہ دم توڑ دیتے ہیں بالکل ایسے ہی جیسے پت جھڑ میں پتے زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں رشید امجد مارشل لاء کی منظر کشی کچھ یوں کرتے ہیں:۔

''قبرستان کی آمنے سامنے کی دیواروں پر بیٹھے ہوئے وہ اور میں درمیان میں چُپ قبرستان۔ یہ پت جھڑ کا موسم ہے۔ پیاسے درختوں کے بنجر ہاتھوں سے وقفہ وقفہ سے پھسلتے پتے ویران قبروں پر خاموشی سے گرتے ہیں؛ ہوا رُکی ہوئی ہے اور فضا میں کبھی کبھی کسی اداس پرندے کی آواز لحہ بھر کے لیے نشان بناتی ہے پھر ڈوب جاتی ہے۔ تھکاوٹ سے چُور راستے قبروں کے درمیان چپ چاپ لیٹے ہوئے ہیں۔''(43)

اسی افسانے میں مارشل لاء کے دوران زباں بندی کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''میں جس دیوار پر بیٹھا ہوا ہوں وہ بھی کھو گئی ہے، مجھے اپنا آپ بھی نظر نہیں آرہا میں سوچتا ہوں، میں چیختا ہوں مگر میری آواز اندھیرا ہے۔ میں بولنا چاہتا ہوں، مگر میرے لفظ اندھیرا ہیں۔ میں سوچتا ہوں۔۔۔۔۔ میں ہوں۔ اس سے آگے اندھیرا گاڑھا اندھیرا۔''(44)

کسی بھی ملک میں فوج کا وجود اُس ملک کی حفاظت کا پرچار کرتا ہے۔ فوج کا اولین کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ اس لیے اُسے عوام کی دیے جانے والے ٹیکس سے تنخواہ جات اور مراعات دی جاتی ہیں۔ پاکستان میں یہ معاملہ اس لیے انتہائی سنگین ہے کہ پاکستان کے پورے بجٹ میں سے پچاس فی صد سے زیادہ بجٹ دفاع کے نام پر رکھا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہماری افواج اس قدر مضبوط ہو گئی ہیں کہ وہ بار بار اپنا ملک فتح کرتی رہتی ہیں۔ جن ممالک کی افواج باہر کے دشمنوں سے زیادہ اپنے ملک باسیوں کو دشمن سمجھ کر بار بار فتح کرنے لگیں تو وہ ملک رفتہ رفتہ قبرستان بن جاتا ہے۔ رشید امجد اپنے اس افسانے میں مارشل لاء لگانے والوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے علامتی انداز میں لکھتے ہیں:۔

> ''انھوں نے خوابوں، چاہتوں اور جذبوں میں گوندھ گوندھ کر یہ شہر بنایا، اور گیت گاتے ہوئے اس میں داخل ہوئے، اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ ان کی قربانیاں رنگ لائیں، پھر بعد چند دنوں کے وسوسوں نے انھیں آن گھیرا، کسی نے ان کے دل میں شک ڈال دیا کہ دشمن ان کے شہر کو لوٹنا چاہتے ہیں، انھوں نے شہر کی حفاظت کے لیے سپاہی رکھے اور اپنی روٹی میں سے حصہ کاٹ کر انھیں دینے لگے۔''(45)

رشید امجد لکھتے ہیں:۔

> ''تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ سپاہی ان کے حصے کی روٹی کھا کھا کر خوب موٹے تازے ہو گئے اور ان کی تعداد شہر والوں سے زیادہ ہو گئی۔ وہ دشمن کا انتظار کرنے لگے، لیکن جب بہت عرصہ تک کسی طرف سے دشمن دکھائی نہ دیا تو انھوں نے خیالی دشمن کی باتیں شروع کر دیں۔ مگر پھر بھی کام نہ بنا تو انھوں نے شہر والوں کو دشمن سمجھ لیا اور کہنے لگے ہم شہر والوں سے شہر کی حفاظت کریں گے۔''(46)

رشید امجد مزید لکھتے ہیں:۔

> ''ان کے سپاہی دشمن کو فتح کرنے کی تو سکت نہیں رکھتے تھے اس لیے اپنی بہادری کا بھرم رکھنے کے لیے خود ہی بار بار اپنے شہر کو فتح کرنے لگے اور شہر والے دشمن قرار پائے اور ان کے شہر کی حفاظت سپاہیوں کا مقدس فرض، سپاہیوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی، پھر

دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ شہر والے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے اور صرف سپاہی ہی سپاہی رہ گئے، گلیاں اور مکان بونے ہو گئے اور رفتہ رفتہ بُھر بُھر کرتی قبریں بن گئے۔''(47)

''پت جھڑ میں خود کلامی'' میں رشید امجد نے پت جھڑ کی علامت مارشل لاء کے عہد کے لیے استعمال کی ہے۔ اسی طرح قبرستان وہ ملک ہے جو بار بار اپنی افواج سے فتح ہو کر قبرستان بن جاتا ہے جہاں زندگی کا وجود نہیں۔ افسانے میں بتایا گیا شہر پاکستان کی علامت ہے۔ رشید امجد نے مارشل لاء کے مختلف ادوار دیکھے ہیں اور اُن کی اپنے ملک سے محبت کی دلیل یہ ہے کہ وہ اس پت جھڑ کے موسم میں بھی اپنے فرض سے نہیں چوکتے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے پریشان نظر آتے ہیں۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''میری بیوی مجھے شانے سے پکڑ کر ہلاتی ہے۔۔۔۔۔۔''اب سو بھی جائیں رات بہت ہو گئی ہے۔'' میں خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوں ''آپ کیا سوچتے رہتے ہیں آج کل'' وہ پریشانی سے پوچھتی ہے۔ میں جواب نہیں دیتا اور مڑ کر سوئی ہوئی بیٹی کو دیکھتا ہوں، جو اندھیرے سے بے خبر چوسنی منہ میں لیے مستقبل کے دھندلے زینے چڑھ رہی ہے اور نہیں جانتی کہ اس کے مستقبل کے سنہری خوابوں کے گرد خون خوار چہروں والے کتے غرّا رہے ہیں۔''(48)

رشید امجد کے افسانے ''میلہ جو تالاب میں ڈوب گیا'' میں پاکستان کے ساتھ ہونے والے مختلف واقعات کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت پائی جاتی ہے۔ رشید امجد اس افسانے میں مارشل لاء اور پاکستانی سیاست دانوں کی چالاکیوں کو علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔ شاعری کی طرح اس افسانے میں بھی صنعت تضاد پائی جاتی ہے کیوں کے ایک جگہ سمندر علامت کے طور پر استعمال ہو رہا ہے تو دوسری جانب تالاب۔ سمندر وقت کی علامت بھی ہے اور آزادی کی بھی جبکہ تالاب محدودیت اور غلاظت کی علامت ہے۔ رشید امجد مارشل لاء زدہ ملک کو وہ ملک کہتے ہیں جو تالاب میں ڈوب گیا ہو۔ مارشل لاء کی گھٹن کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''مجھے آوازیں سنائی دیتی ہیں مگر جسم دکھائی نہیں دیتے۔ وقت ایک پر کٹے کبوتر کی طرح میرے کندھے پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں اُسے ہُش ہُش کر کے اُڑانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، مگر وہ اُڑنے کا نام ہی نہیں لیتا، میں ہُش ہُش کرتا رہتا ہوں۔ میری بیوی بڑی احتیاط سے مجھے طے کر کے کتابوں کی الماری میں رکھ دیتی ہے لیکن میں اس کی نظر بچا کر چپکے سے باہر نکل آتا ہوں اور بڑے چوک کی طرف چل پڑتا ہوں۔ لیکن میں بڑے چوک سے آگے نہیں جا سکتا کہ میرے پاس جو اجازت نامہ ہے اس کی حد یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس شہر میں پھول اگانے کی بھی اجازت نہیں کہ کلی کا کھلنا بھی فحاشی کے زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے کام اجازت ناموں سے ہوتے ہیں مرنے کے لیے بھی اجازت لینا پڑتی ہے اسی لیے میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔''(49)

رشید امجد پاکستان کے حاکموں اور عوام کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اس شہر کے لوگوں کو تاریخ بنانے کا بڑا چسکہ ہے مگر ان کا جغرافیہ روز بروز سمٹتا چلا جا رہا ہے لیکن انھیں پرواہ نہیں۔ جغرافیہ رہے نہ رہے تاریخ ضرور بننی چاہیے۔''(50)

رشید امجد پاکستان کو ایک ایسا میلہ کہتے ہیں جس میں ہر طرف رونق ہی رونق تھی، دُکانیں سجی ہوئی تھیں ہر سو روشنیاں ہی روشنیاں تھیں لیکن اچانک مارشل لاء نے اسے تالاب میں دھکیل دیا اور اب جس شہر میں ہم آباد ہیں وہ اسی تالاب میں اگا ہوا ہے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''تالاب کے کنارے مزار کے گرد لگا ہوا میلہ نشے میں جھوم رہا ہے، رنگ برنگی روشنیاں، بھری ہوئی دُکانیں، سجے ہوئے پنڈال اور قہقہے لگاتے لوگ، میلہ موج میں آکر ایک بھرپور انگڑائی لیتا ہے، اور اس کا پاؤں پھسل کر تالاب کے بُھر بُھرے کناروں پر آپڑتا ہے۔ تالاب بہت پرانا ہے اور اس کے کنارے اتنے بُھر بُھرے ہو گئے ہیں کہ وہ میلے کے پھسلتے پاؤں کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتے اور بیٹھ جاتے ہیں۔ میلہ اپنے آپ کو سنبھالنے اور پھیلے ہاتھوں سے آس پاس کی اونچائیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، مگر تالاب کے پرانے اور بُھر بُھرے کنارے اسے سنبھلنے نہیں دیتے اور میلہ اپنی رنگ برنگی روشنیوں، بھری دُکانوں، سجے پنڈال اور قہقہے لگاتے لوگوں سمیت پلک جھپکنے میں تالاب میں جا گرتا

ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب جاتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد تالاب سے یہ شہر اُگتا ہے اور میں
نہیں جانتا کہ کب یہ شہر بھی پھسل کر کسی تالاب میں جا گرے گا، اسی لیے تو میں مرنے
سے پہلے مرنے کا تجربہ کر لینا چاہتا ہوں۔''(51)

رشید امجد پاکستانی سیاست دانوں کے ہتھکنڈوں اور عوام کے خلاف بھی علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اشرافیہ نے نچلے طبقے کو یہ یقین دلا رکھا ہے کہ اگر انھیں کچھ ہو گیا تو یہ طبقہ جو اُن کے جلسے جلوسوں میں نعرے مارنے کے کام آتا ہے خدا جانے ان کا کیا ہو گا۔ یہ لوگ اتنے بزدل اور احمق ہیں کہ اپنے رہنماؤں کی محبت میں اُن کا کوئی عیب دیکھنے کو راضی نہیں۔ اس کی زندہ مثال ایم کیو ایم کے بانی رہنما الطاف حسین صاحب ہیں۔ جنھیں ملک بدر ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ وہ ٹیلی فون کے ذریعے خطاب کرتے ہیں اور بار بار اپنی پارٹی کے لوگوں کو اپنے ہی استعفے کی دھمکیاں دیتے ہیں اور یہ جاہل سسکیاں بھرتے رہتے ہیں۔ اسی ڈرامے کی تصویر کشی رشید امجد کچھ یوں کرتے ہیں:۔

''میں خودکشی کر رہا ہوں'' مجمع میں سسکاریاں اُبھرتی ہیں، وہ شخص چبوترے کے درمیان
لگے بجلی کے پول پر چڑھنے لگتا ہے۔ چکنے پول پر اس کے ہاتھ بار بار پھسلتے ہیں اور وہ چند فٹ
اوپر جا کر پھر نیچے آجاتا ہے، مجمع کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں، جونہی اس کے ہاتھ پھسلتے ہیں
مجمع اطمینان کا سانس لیتا ہے، لیکن جب وہ پھر چند فٹ اوپر کھسکتا ہے تو مجمع کی سانسیں رُک
جاتی ہیں، وہ اوپر چڑھنے کی کوشش میں کئی قدم پھسلتا اور پھر دھڑام سے نیچے چبوترے پر
میرے کانوں کے قریب آگرتا ہے۔ کپڑے جھاڑ کر اُٹھتا ہے اور مجمع کی طرف منہ کر کے
کہتا ہے ''میں خودکشی کر رہا ہوں'' مجمع کے منہ سے سسکاریاں نکلتی ہیں۔''(52)

رشید امجد نے اس افسانے میں کئی علامتیں استعمال کی ہیں۔ سب سے پہلی علامت سمندر ہے، جو آزادی اور وقت کی ضرورت ہے جسے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں جہاں جی چاہے وہ جا سکتا ہے۔ دوسری علامت تالاب ہے۔ تالاب مارشل لاء کی علامت ہے جس کی پابندیوں کے باعث معاشرے میں بدبو پھیل جاتی ہے۔ اس تالاب میں گرنے والا شہر پاکستان کی علامت ہے جو اپنی تمام تر چکاچوند اور تمکنت کے ساتھ اس تالاب

میں گر کر غرق ہو گیا اور اب جو نیا شہر اُگ رہا ہے وہ بھی اسی تالاب کے اندر اُگ رہا ہے۔ افسانے میں دکھایا گیا میلہ زندگی کی علامت ہے۔ خود کشی کے کرتب دکھانے والا شخص ہمارے سیاسی رہنماؤں کی علامت ہے جو مختلف کرتب کر کے اپنے پیروکاروں کو مطمئن کیے رکھتے ہیں۔

رشید امجد کا افسانہ ''کوڑا گھر میں تازہ ہوا کی خواہش'' میں مارشل لاء، اس کی پابندیاں، اس کی گھٹن اور زباں بندی کے ساتھ ساتھ معاشرے میں پائی جانے والی فرسودہ روایات کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔ افسانے کے عنوان میں ہی وہ پورے پاکستان کے لیے کوڑا گھر کی علامت استعمال کرتے ہیں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ کوڑا گھر میں کہیں سے تازہ ہوا آئے لہذا یہ خواہش کرنا ہی بے وقوفی ہے۔ رشید امجد کے مطابق مارشل لاء کے بار بار لگنے سے پاکستان ایک کوڑا گھر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ کوڑا گھر میں داخل ہوتے ہیں انسان اپنی ناک اور منہ پر ہاتھ یا کوئی کپڑا رکھ لیتا ہے۔ جیسے ہم مارشل لاء کی زباں بندی کہہ سکتے ہیں۔ رشید امجد زباں بندی کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''لفظ۔۔۔۔ جو اس شہر کی الماری میں، کتابوں کے پنجروں میں بند قیدِ تنہائی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ لفظ جو باسی ہو جائیں تو بو دینے لگتے ہیں۔ تعفن سے لبریز گندی بو۔ میں جلدی سے کتاب بند کر دیتا ہوں۔ لفظ اپنے قید خانے میں سمٹ جاتے ہیں۔''(53)

رشید امجد زباں بندی کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:۔

> ''لکھے ہوئے سارے لفظ زنجیریں ہیں۔ اور جو لفظ لکھے نہیں گئے انھیں لکھنے کی جرات نہیں۔''(54)

مارشل لاء کے آتے ہی کئی خوف سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ ساری عوام پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔ ابتدائی طور پر تو لوگ گھروں میں محصور ہو جاتے ہیں۔ لوگ کیا ٹی وی اور ریڈیو کی نشریات بھی عارضی طور پر معطل کر دی جاتی ہیں۔ پھر مارشل لاء کے قوانین واضح ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ کئی پابندیاں لے آتے ہیں اور معاشرہ گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔ مارشل لاء کے عہد میں پائی جانے والی گھٹن کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''میں اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر سیٹی بجاتا ہوں، وہ نیم پٹ کھول کر سرگوشی کرتی ہے۔۔۔۔۔'' کوئی دیکھ نہ لے'' ''ہاں کوئی دیکھ نہ لے'' دیکھ لیے جانے کا خوف آسیب بن کر پورے شہر پر منڈلا رہا ہے۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ بند کمروں میں بھی دیکھ لیے جانے کا تشنج۔''(55)

رشید امجد مارشل لاء کی پابندیوں کے بارے مزید لکھتے ہیں:۔

''ہوا اپنی سرمئی انگلیوں سے ہمیں گدگداتی ہے لیکن ہمیں ہنسی نہیں آتی۔ شہر میں ہنسنے پر پابندی ہے۔ ہم ہنسے بغیر پوری سنجیدگی سے اپنے اپنے عکس کی مضحکہ خیزی کا تماشا کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اس مضحکہ خیزی کا احساس بھی ہے لیکن ہنسنے پر پابندی ہے۔''(56)

رشید امجد اسی افسانے میں معاشرے میں پائی جانے والی فرسودہ روایات کو مزاحمت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

''سب نے وزنی ٹوکرے اُٹھا رکھے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم ان میں کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ اندر سے تو یہ کب کے خالی ہو چکے ہیں ہم تو صرف ان کی بوسیدگی کا بوجھ اُٹھائے پھرتے ہیں۔'' میں نے اس برقعہ کے نیچے جدید فیشن کا لباس پہنا ہوا ہے۔'' ''مجھے معلوم ہے'' یہ بات سارے شہر کو معلوم ہے لیکن پھر بھی سارے شہر نے برقعہ اوڑھا ہوا ہے۔ اپنے آپ سے بھی چھپنے کا شوق یا بیماری۔''(57)

رشید امجد اپنے افسانے ''شہر بدر، شہر'' میں آمریت کو علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔ ادیب، شاعر اور مؤرخ کسی بھی معاشرے کے توازن کے لیے ستونوں کا کام کرتے ہیں۔ جب کوئی معاشرہ ان میں سے کسی ایک ستون سے محروم ہو جائے اُس میں توازن باقی نہیں رہتا لیکن ہمارے معاشرے میں یہ تینوں ستون گر چکے ہیں۔ ادیب جب ادب لکھتا ہے تو اُس میں اُس دور کا آئینہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے مسائل، تہذیب و تمدن اور معاشرتی حقائق کو رقم کرتا ہے۔ جس سے معاشرے میں بسنے والے راہ پاتے ہیں اور اپنی زندگیاں ایک باشعور شہری کی طرز پر بسر کرتے ہیں لیکن شعور اور آگہی آمرانہ حکومت کے لیے مسائل پیدا کرتی

ہے۔رشید امجد کے مطابق مارشل لاء کے عہد میں معاشرے سے ادیب کو نفی کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ معاشرے اور حکام کو آئینہ نہ دیکھا سکے۔رشید امجد لکھتے ہیں:۔

> ''میں چوراہے پر کھڑا ہوتا اور داستان شروع کرنا چاہتا تو لوگ ادھر اُدھر ہو جاتے۔پس اپنی داستان خود ہی سنتا، سنو بھائی میں ایک ایک کو روکتا، پکارتا، سنو، لیکن کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کبھی کبھی گمان گزرتا کہ شاید شہر والے سماعت سے محروم ہیں لیکن ایسا نہیں تھا،اپنے مطلب کی بات فوراً سن بھی لیتے اور سمجھ بھی لیتے۔میں ایک چوراہے سے دوسرے چوراہے کی طرف جاتا لیکن کوئی میرے قریب نہ آتا۔لگا وہ داستان سننا ہی نہیں چاہتے۔''(58)

رشید امجد مزید لکھتے ہیں:۔

> ''کوتوال نے پہلے غصہ کیا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔۔۔۔۔''اجنبی ہو، تمھیں شاید معلوم نہیں کہ اس شہر میں داستان سننا اور سنانا منع ہے۔'' میں نے پوچھا۔۔۔۔۔'' کیوں'' کوتوال سوچ میں پڑ گیا۔۔۔۔۔''یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن حکم ہے کہ داستان نہ سنی جائے۔'' میں نے پھر پوچھا۔۔۔۔۔'' لیکن کیوں'' کوتوال کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔۔۔۔'' میں نے کسی سے سنا ہے کہ داستانوں میں اپنا آپ دکھائی دیتا ہے اور شہر کے لوگ اپنے آپ کو دیکھنا نہیں چاہتے۔'''' شہر کے لوگ یا۔۔۔۔۔''میں نے پوچھنا چاہا۔ کوتوال کو غصہ آگیا، سپاہیوں سے کہا'' اسے شہر سے نکال دو۔''(59)

ادیب اور شاعر اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر معاشرے میں پائے جانے والے مسائل کو عام انسان کی نسبت جلد بھانپ جاتے ہیں۔ادباء اور شعرا کا کام مسائل کی نشاندہی ہوتا ہے۔یہ اپنے تیز قوت مشاہدہ کو کہانیوں یا نظموں کی صورت میں معاشرے میں بسنے والوں کے سامنے لے آتے ہیں۔اسی لیے ایسے ادیب یا شعرا جو اپنے قلم نہیں بیچتے وہ حکومت کے لیے دردِ سر بن جاتے ہیں اسی لیے ان کو شہر بدر کرنا ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''میں شاعر ہوں اور شہر والوں نے مجھے شہر بدر کر دیا ہے۔ میں نے شہر آشوب لکھا تھا، لوگ ناراض ہو گئے اور بولے ''تم ہمارا تمسخر اُڑاتے ہو۔'' میں نے کہا۔۔۔۔''میں نے وہی لکھا ہے جو دیکھ رہا ہوں'' وہ اور ناراض ہو گئے۔۔۔۔ تم اندھے ہو، حاسد بھی ہو ہماری خوشیوں سے جلتے ہو۔''(60)

''آخر میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔۔۔'' تمھیں قصیدہ کیوں پسند ہے؟'' بولے۔۔۔''عالی مرتبت کو بھی صرف قصیدہ ہی پسند ہے، اس لیے ہمیں بھی۔'''' تم شہر آشوب لکھتے ہو، تمھیں معلوم نہیں کہ یہ جرم ہے۔'' میں نے کہا جو دکھائی دیتا ہے، وہی تو لکھتا ہوں۔'' کوتوال ہنسا پھر بولا۔۔۔''عالی مرتبت نے اسی جواب میں ایک شاعر کی آنکھیں نکلوادی تھیں۔''(61)

''کوتوال نے مجھے کہا کہ یا اپنی آنکھیں نکلوالو یا شہر چھوڑ دو۔ میں نے چوراہے پر کھڑے ہو کر آخری کوشش کی لیکن لوگوں کی ساری حس مر گئی تھی۔ میں آنکھیں نہیں نکلوانا چاہتا تھا اس لیے رات کا اندھیرا پھیلتے ہی شہر سے نکل آیا۔''(62)

تاریخ کا مطالعہ قوموں کو زندہ رکھتا ہے۔ یہ گزری قوموں کی ترقی کے راز اور زوال کے اسباب بیان کرتا ہے۔ جس سے معاشرے میں اُبھرنے والے مسائل کو باآسانی حل کیا جا سکتا ہے اور ترقی کی نئ منازل عبور کرنے کی سعی کی جا سکتی ہے۔ رشید امجد کے مطابق ہمارا معاشرہ پوری طرح اپنے حکام کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ حکام کسی صورت نہیں چاہتے کہ معاشرے میں علم پروان چڑھے اور لوگ باشعور ہوں۔ جب اقوام باشعور ہو جاتی ہے تو حکام کی من مانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہمارے ہاں حکمران ہر وہ ہتھکنڈا اپناتے ہیں جن سے اُن کا اور اُن کی نسلوں کا مستقبل اُن کی مرضی مطابق ہو۔ حکمران طبقہ نہ صرف اپنی حکومت میں قصیدے سننا چاہتا ہے بل کہ وہ تاریخ کے اوراق میں بھی اپنا نام سنہری حروف سے لکھوانے کے خواہش مند ہوتے ہیں اس لیے وہ مؤرخوں کو خرید کر تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''اس شہر میں تاریخ لکھنے اور پڑھنے کی کسی کو اجازت نہیں، لوگوں نے بھی اسے قبول کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں تاریخ پڑھنے سے انا پر زد پڑتی ہے۔ عالی مرتبت کا پہلے یہ خیال تھا کہ

مؤرخ کو درباری بنا کر اس سے اپنی مرضی کی تاریخ لکھوائی جاسکتی ہے لیکن مؤرخوں نے
انھیں چکمہ دیا۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے سچ بات لکھ جاتے تھے۔ پر عالی مرتبت نے تاریخ
لکھنے اور پڑھنے پر پابندی لگادی۔''(63)

جب معاشرہ اس قدر پابندیوں میں جکڑا ہو تو معاشرے میں رہنے والے انسان نہیں رہتے۔ اُن کے یہاں احساس کا فقدان ہو جاتا ہے اور وہ مادہ پرستی کی سمت بڑھ جاتے ہیں۔ جس شہر میں احساس نہ ہو اور مادہ پرستی ہی باقی بچ جائے تو وہ شہر نہیں بل کہ جنگل کہلاتا ہے کیوں کہ ایک احساس ہی انسان اور حیوان میں تفریق کرتا ہے۔ رشید امجد کے اس افسانے میں مارشل لاء کی پابندیوں کی بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں۔ وہ علامتوں کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ اس افسانے میں شہر پاکستان کی علامت ہے۔ داستان گو ادباء کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

رشید امجد کا یہ افسانہ ''چار درویشوں کی نئی کہانی'' مارشل لاء کے خلاف مزاحمت کا علامتی اظہار ہے۔ مارشل لاء کے عہد میں فردِ واحد کی حکومت ہوتی ہے۔ پابندیاں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ لوگوں کو گونگا، بہرا اور اندھا بن کر گزر بسر کرنا ہوتا ہے۔ ہر طرف ایک خوف کی فضا ہوتی ہے۔ ڈر کے مارے لوگ بولتے نہیں کہ کہیں اُن سے خلاف قانون کوئی بات نہ ہو جائے۔ کوئی بولے بھی تو سنتے نہیں کہ یہ تو سزا پائے گا ساتھ کے ساتھ ہم بھی دھر لیے جائیں گے۔ پورے کا پورا ملک گونگا ہو جاتا ہے۔ نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے اور نہ ہی دیکھتا ہے۔ مارشل لاء میں ایک وصف یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے اعمال پر بڑی بڑی سزائیں تجویز کی جاتی ہیں تاکہ عوام کو خوف زدہ کیا جاسکے۔ رشید امجد مارشل لاء کے عہد کی جھلکیاں کچھ یوں پیش کرتے ہیں:۔

''اصل بات یہ ہے کہ امیر شہر خود اندھا تھا اور یہ بات اُس کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں
تھی۔ شروع شروع میں شاید اس کے گرد دیکھنے والے موجود رہے ہوں لیکن اس نے
ایک ایک کر کے سبھوں کو مروادیا پھر ایک ایک کر کے اندھے اس کے گرد جمع ہو گئے۔
ان میں سے کوئی بھی خود کو اندھا ماننے کے لیے تیار نہ تھا، اب امیر شہر بے فکر ہوا اس نے
اپنے اجداد سے ہٹ کر اپنے طور پر شہر کے طور طریقے وضع کیے۔''(64)

رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''ایک ایک کر کے بینائی جاتی رہی، بینائی چلی جائے تو اندھیرے آجاتے ہیں لیکن کسی نے اسے تسلیم نہ کیا۔ دکھائی نہ دے تو دن اور رات کا فرق جاتا رہتا ہے۔ پھر یہ فرق اچھے برے کی تمیز بھی ختم کر دیتا ہے۔'' پہلا درویش وقفہ لینے کے لیے چپ ہوا پھر بولا۔۔'' بینائی کے ساتھ ساتھ ان کی بصیرت بھی گئی۔ جب کچھ دکھائی نہ دے تو دوسروں کے ہونے کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ہر شخص صرف ''میں'' ہی رہ گیا۔''(65)

''چند ہی دنوں میں میں بے بس ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ کسی کے اشاروں کو دوسرا جو بھی سمجھ لے وہی درست ہے اور لوگ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو مار دیتے ہیں۔''(66)

''شہر بھر میں کوئی بولتا تھا تو امیر شہر تھا، باقی سب سنتے تھے۔ کہتے ہیں بہت پہلے کسی عام آدمی نے امیر شہر کو بات کرتے ٹوک دیا تھا۔ اس پر امیر شہر اتنا غصے میں آیا کہ بولنے والے کی زبان کٹوا دی۔ پھر حکم ہوا کہ پیدا ہوتے ہی زبان کاٹ دی جاتی ہے۔ اب زبان ہے تو جانوروں کی، جو صبح سے شام تک خوب بولتے ہیں، ڈکارتے ہیں، عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہیں اور امیر شہر انھیں سن کر خوش ہوتا ہے۔''(67)

انسان کے شعور اور قوت مشاہدہ کی وسعت کے لیے تین حسیات اہم کردار ادا کرتی ہیں جن میں زبان، کان اور آنکھ ہے۔ جن لوگوں کی یہ حسیات زیرک ہوتی ہیں وہ ادیب، صحافی، شاعر یا مؤرخ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات کو کسی نہ کسی ادبی ہیئت میں ڈھال کر عوام کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے مارشل لاء لگنے کے ساتھ ہی زباں بندی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جب زباں بندی کا قانون رائج ہو جاتا ہے تو پھر نہ کوئی بولتا ہے نہ سُنتا ہے اور نہ ہی دیکھتا ہے۔ اگر کوئی ایسا کرنے کی جسارت کرے تو رات کی تاریکی میں قبرستان کے سناٹے میں دھر لیا جاتا ہے۔

رشید امجد کا شمار علامتی تحریک کے بنیادی ارکان میں ہوتا ہے۔ ان کا انوکھا اسلوب اُن کی اپنی پہچان ہے۔ اُن کی لکھت تک رسائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں وہ صرف خاص قارئین کے لیے لکھتے ہیں۔ رشید امجد کہتے ہیں:۔

> ''میں عام آدمی کے لیے نہیں لکھتا، میرا قاری مجھے خود تلاش کرتا ہے، میری لذتوں میں وہی شریک ہو سکتا ہے جو میرے تجربے کی اسراریت کو محسوس کرتا ہے۔''(68)

وہ فن افسانہ نگاری پر مکمل گرفت رکھتے ہیں۔ داخلی واردات کا بیان ہو یا خارجی وہ کہانی سے دامن نہیں چھڑاتے بل کہ کہانیوں سے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دورِ حاضر کے بڑے اور قدآور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے نہ صرف علامتی افسانے لکھے بل کہ علامتی افسانہ نگاروں کے لیے نئی راہیں بھی متعین کیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں علامتی افسانے پر لگائے جانے والا یہ داغ دھو ڈالا کہ علامتی افسانے میں کہانی کا فقدان ہوتا ہے۔ اُن کے ۲۰۶ افسانوں میں سے کوئی بھی ایسا افسانہ نہیں جس میں کہانی کا فقدان پایا جاتا ہو۔ رشید امجد ایک افسانہ نگار نہیں بل کہ ایک عہد کا نام ہے جو افسانوں کی صورت ہمیشہ موجود رہے گا۔

حوالہ جات:

1 انوار احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، (ملتان کینٹ: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء)، ص۵۹۱۔

2 صفیہ عباد ڈاکٹر، ''پیش لفظ''، مشمولہ: رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص۱۱۔

3 رشید امجد، افسانہ ''بے پانی کی بارش''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص۱۶۶۔

4 ایضاً۔

5 ایضاً، ص۱۶۷۔

6 ایضاً، ص۱۶۸۔

7 ایضاً، ص۱۶۹۔

8 ایضاً، ص ۱۷۰۔

9 ایضاً۔

10 ایضاً۔

11 ایضاً۔

12 ایضاً، ص ۱۷۳۔

13 رشید امجد، افسانہ ''بے دروازہ سراب''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۱۹۔

14 ایضاً، ص ۳۲۱۔

15 رشید امجد، افسانہ ''کھلی آنکھ میں دھندھوتی تصویر''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۲۴۔

16 ایضاً، ص ۳۲۵۔

17 رشید امجد، افسانہ ''چپ صحرا''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۱۱۔

18 ایضاً، ص ۴۱۲۔

19 ایضاً، ص ۴۱۱۔

20 ایضاً، ص ۴۱۴۔

21 رشید امجد، افسانہ ''بنجر لہو منظر''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۱۹۔

22 ایضاً، ص ۴۱۵۔

23 ایضاً، ص ۴۱۶۔

24 ایضاً، ص ۴۱۸۔

25 ایضاً، ص ۴۱۷۔

26 رشید امجد، افسانہ ''بیکسئ پرواز''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۸۷۔

27 ایضاً، ص ۴۸۸۔

28 ایضاً۔

29 ایضاً، ص ۴۸۹۔

30 رشید امجد، افسانہ ''سکرپٹ''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۶۸۴۔

31 https: //www.samaa.tv/urdu/blogs/۲۰۱۶/۰۴//۳۵۳۱۰۶

32 رشید امجد، ''گملے میں اگا ہوا شہر''، مشمولہ: سہ پہر کی خزاں، (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، ۱۹۸۰ء)، ص ۹۔

33 بے نظیر بھٹو، مشرق کی بیٹی، مترجم: سجاد بخاری، (اسلام آباد: مساوات پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۲۰۹۔

34 رشید امجد، افسانہ ''گملے میں اگا ہوا شہر''، مشمولہ: سہ پہر کی خزاں، (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۲۔

35 رشید امجد، افسانہ ''سناٹا بولتا ہے''، مشمولہ: سہ پہر کی خزاں، (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۶۔

36 ایضاً، ص ۱۴۔

37 ایضاً، ص ۱۷۔

38 ایضاً، ص ۱۷۔

39 ایضاً، ص ۱۸۔

40 ایضاً، ص ۱۵۔

41 ایضاً، ص ۱۸۔

42 ایضاً، ص ۱۶۔

43 رشید امجد، افسانہ ''پت جھڑ میں خود کلامی''، مشمولہ: سہ پہر کی خزاں، (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، ۱۹۸۰ء)، ص ۲۲۔

44 ایضاً، ص ۲۵۔

45 ایضاً، ص ۲۳۔

46 ایضاً، ص ۲۴۔

47 ایضاً، ص ۲۵۔

48 ایضاً، ص ۲۶۔

49 رشید امجد، افسانہ ''میلہ جو تالاب میں ڈوب گیا''، مشمولہ: سہ پہر کی خزاں، (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، ۱۹۸۰ء)، ص ۳۰۔

50 ایضاً، ص ۳۲۔

51 ایضاً۔

52 ایضاً۔

53 رشید امجد، افسانہ ''کوڑا گھر میں تازہ ہوا کی خواہش''، مشمولہ: سہ پہر کی خزاں، (راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، ۱۹۸۰ء)، ص۳۴۔

54 ایضاً، ص۳۹۔

55 ایضاً، ص۳۸۔

56 ایضاً، ص۳۹۔

57 ایضاً۔

58 رشید امجد، افسانہ ''شہر بدر شہر''، مشمولہ: کہانی نے خواب دیکھا، (راولپنڈی: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ص۲۳۔

59 ایضاً، ص۲۴۔

60 ایضاً۔

61 ایضاً، ص۲۵۔

62 ایضاً۔

63 ایضاً۔

64 رشید امجد، افسانہ ''چار درویشوں کی نئی کہانی''، مشمولہ: کہانی نے خواب دیکھا، (راولپنڈی: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ص۷۶۔

65 ایضاً، ص۷۷۔

66 ایضاً، ص۷۸۔

67 ایضاً، ص۷۹۔

68 رشید امجد، افسانہ ''میں کیوں لکھتا ہوں''، مشمولہ: عام آدمی کے خواب، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص۱۴۔